پروفیسر حامد خاں حامد

اقبال اور فارسی شاعری کی روایات

اقبال اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر ہیں۔ لیکن یہ افسوس کی بات ہے کہ ان کے اردو کلام پر جتنی توجہ ہوئی ہے اتنی فارسی کلام پر نہیں ہوئی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے جتنا کچھ فارسی میں لکھا ہے، اردو میں نہیں لکھا۔ ان کی کئی اہم تصانیف فارسی میں ہیں اور اردو تصانیف پر بھی فارسیت کا غلبہ ہے۔ ذہنی رشتے کے اعتبار سے وہ ولی، میر، درد اور سودا وغیرہ کے مقابلے میں سعدی، رومی، حافظ، عرفی، نظیری، فیضی اور بیدل وغیرہ کے زیادہ قریب ہیں، اور اردو کی قدیم اور کلاسیکی شاعری سے ان کا تعلق کچھ مبہم ہی رہا ہے۔

اقبال نے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے فارسی کو کیوں منتخب کیا؟ اس کے کئی اسباب ہیں جن میں ایک اہم ترین سبب پیام اقبال کی عالمگیر نوعیت ہے۔ فارسی زبان کئی ممالک میں سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ اقبال نے اپنے فلسفیانہ افکار و خیالات کو فارسی کے سانچے میں ڈھال کر اپنی شاعری کو مقامیت کی قید سے آزاد کر دیا۔ اگر وہ صرف اردو میں اپنے پیغام کا اظہار کرتے تو ان کے کلام کو آفاقیت نصیب نہ ہوتی، اور ان کی حیثیت بھی وہی ہوتی جو اردو کے دوسرے شاعروں کی ہے۔ یعنی برصغیر پاک و ہند کی چار دیواری کے علاوہ انھیں کسی دوسرے ملک میں جانا پہچانا نہ جاتا۔

ایرانیوں نے اقبال کی فارسی شاعری پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا ہے کہ ان کی زبان میں بولی ٹھولی کا مزہ، زبان کا چٹخارہ، روزمرہ کی چاشنی اور محاورے کا لطف نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ خود اقبال نے ان چیزوں کا دعویٰ کب کیا ہے۔ ان کے نزدیک اصل اہمیت تو دعوت پیغام اور فکر کو حاصل ہے، اور زبان کا درجہ ثانوی ہے، چنانچہ وہ اسرار خودی کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں کہ:

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست　　بت پرستی، بت گری مقصود نیست

ہندیم از فارسی بے گانہ ام　　ماہ نو باشم تہی پیمانہ ام

حسن انداز بیاں از من مجو خوانسار و اصفہان از من مجو

اقبال نے اپنے افکار و خیالات کے لیے جس فارسی زبان کو آلۂ اظہار بنایا ہے وہ قدما کی زبان ہے، کلاسیکی شاعروں کی فارسی ہے خواہ وہ ایران سے تعلق رکھتے ہوں یا پاک و ہند سے۔ ایران کے قدیم شعرا اور پاک و ہند کے کلاسیکی شعرا کی فارسی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر ہے تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ اقبال نے کلاسیکی شعرا کی زبان میں گفتگو کی ہے، جدید ایرانی فارسی سے انھوں نے استفادہ نہیں کیا۔

اپنے افکار عالیہ کو فارسی زبان میں ادا کرنے کے لیے اقبال نے بہت کچھ کیا ہے۔ فارسی زبان کے علم و ادب کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور فارسی شاعری کی اُن روایتوں سے حتی المقدور استفادہ کیا جن کا خیر مقدم فارسی ادب کے مختلف ادوار میں ہوتا رہا۔ ان شعری روایتوں کی تفصیل عصر حاضر کے ایک نامور ادیب اور شاعر ملک الشعرا بہار نے اپنی ضخیم کتاب 'سبک شناسی' میں پیش کی ہے۔ اقبال نے ایرانی ادب کے مطالعہ کا اعتراف اور اس سے استفادہ کرنے کا اقرار جا بجا کیا ہے۔ مثلاً ایک غزل میں جوانانِ عجم سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

چوں چراغِ لالہ سوزم در خیابانِ شما ای جوانانِ عجم! جانِ من و جانِ شما
غوطہ ہا زد در ضمیرِ زندگی اندیشہ ام تا بدست آوردہ ام افکارِ پنہانِ شما
مہر و مہ دیدم، نگاہم برتر از پروین گذشت ریختم طرحِ حرم در کافرستانِ شما
تا سنانش تیز تر گردد فرو پیچیدمش شعلۂ آشفتہ بود اندر بیابانِ شما
فکرِ رنگینم کند نذرِ تہی دستانِ شرق پارۂ لعلی کہ دارم از بدخشانِ شما

اقبال نے فارسی شاعری کی جن روایتوں سے استفادہ کیا، ان میں پہلی روایت سبک خراسانی کی ہے، دوسری سبک عراقی کی اور تیسری سبک ہندی کی۔ چنانچہ ان کے کلام کا جائزہ لینے اور یہ معلوم کرنے کے لیے کہ فارسی شاعری میں ان کا مرتبہ کیا ہے؟ یہ از بس ضروری ہے کہ مذکورہ دبستانہائے فکر سے واقفیت حاصل کی جائے۔ لہٰذا اس کی اجمالی تفصیل یہ ہے:

سبک خراسانی کا موسس اعلیٰ رودکی سمرقندی ہے۔ یہ سامانی دور کا شاعر تھا۔ اسے فارسی شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ فارسی شاعری کا آغاز اس نے کیا بلکہ اس لیے کہ یہ پہلا شاعر تھا جس نے فارسی شاعری کو ایک ایسا اسلوب، ایک ایسا طرز، اور ایک ایسا اسٹائل دیا جس کی پیروی آنے والے دور کے شاعروں نے کی۔ جہاں تک فارسی شاعری کے آغاز کا تعلق ہے وہ رودکی سے کافی پہلے ہو چکا تھا۔ سامانی دور سے پہلے فارسی ادب کے دو دور گزر چکے تھے جن کو تذکرہ نگار علی الترتیب طاہری اور صفاری دور کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

رودکی نے جس اسلوب کو ایجاد کیا، غزنوی دور کے شعرا مثلاً فردوسی، فرخی، عنصری، عسجدی وغیرہ نے اس کی تقلید کی۔ غزنوی دور کے بعد منگولی دور میں یہ روایت سعدی کے پاس آئی۔ سعدی نے ایران میں اس روایت کا خیر مقدم کیا۔ ادھر برصغیر پاک و ہند میں امیر خسرو اور حسن سجزی نے اس شعری روایت کو سینے سے لگایا۔ منگولی دور کے بعد یہ روایت قاآنی کے پاس آئی۔ قاآنی نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ قاچاری دور کے بعد پہلوی دور یعنی عصر حاضر میں ملک الشعرا بہار، عارف قزوینی، پروین اعتصامی، پور داؤد، اور صادق سرمد وغیرہ نے اس روایت کا پرجوش استقبال کیا۔

اس دبستانِ فکر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے پیرو اپنے جذبات و احساسات کو سیدھے سادے الفاظ میں ادا کر دیتے ہیں۔ ان کے پیرایۂ اظہار میں کسی قسم کی مشکل پسندی، دقت طلبی، اور لفظی شعبدہ گری نہیں ہوتی۔ سادگی و سلاست ان کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کی تشبیہیں سادہ، استعارے سلیس، تلمیحیں جانی پہچانی، ترکیبیں آسان اور بندشیں صاف ستھری ہوتی ہیں۔ ان کے اشعار فکر و خیال کی بجائے جذبہ و احساس کی ترجمانی کرتے ہیں۔

سبکِ خراسانی کے بعد سبکِ عراقی کا دور دورہ ہوا۔ اس دبستانِ فکر کا نقطۂ آغاز قطران تبریزی ہے۔ یہ سلجوقی دور کا شاعر تھا۔ صنعت گری کی جو عمارت قطران نے کھڑی کی اس کے در و دیوار اور سقف و بام پر انوری، خاقانی، نظامی، خیام اور ظہیر نے میناکاری کی۔ سلجوقی دور کے بعد یہ روایت رومی کے پاس پہنچی اور رومی سے گزر کر حافظ کے ہاتھوں میں آئی۔ حافظ

نے اس روایت کو معراجِ کمال تک پہنچا دیا۔ حافظ کے بعد اکثر شعرا نے اس روایت کا تتبع کیا لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ اس پر خاطر خواہ اضافہ نہ کر سکے۔ حافظ کے بعد صرف جامی ایک ایسا شاعر ہے جس نے اس دبستانِ فکر میں نام پیدا کیا اور جیسا کہ کسی نے کہا ہے کہ بجامی سخن را تمامی رسید۔ جامی پر اس روایت کا خاتمہ ہو گیا۔

اس دبستانِ فکر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے پیرو جذبہ و احساس کی ترجمانی کرنے کی بجائے فکر و خیال کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے کلام کا پیرایۂ اظہار رنگین اور مرصّع ہوتا ہے۔ دبستانِ خراسانی کی سادگی و سلاست کی جگہ آرائش، تصنع اور تکلف سے کام لیا جاتا ہے۔ اس دبستانِ فکر کے شعرا کی زبان مشکل، تشبیہات دور از کار، استعارات بعید از فہم، تلمیحات نادر، ترکیبات پیچیدہ ہوتی ہیں۔ لیکن با ایں ہمہ ان کے کلام میں لطافت و حلاوت پائی جاتی ہے۔

سبک عراقی کے بعد سبک ہندی کی باری آتی ہے۔ ملک الشعرا بہار کا کہنا ہے کہ یہ روایت ہندی ذہن کی موشگافیوں کا نتیجہ اور ہندوستانی دماغ کی اختراع ہے۔ اس روایت کا موجد کون تھا؟ اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ مغلیہ دور خصوصاً اکبری عہد میں اس روایت کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ عرفی، نظیری اور فیضی نے اس دبستانِ فکر میں ایسے ایسے گل بوٹے کھلائے کہ ان کی مہک نے مشامِ جان کو معطر کر دیا۔ ان شاعروں نے جو نغمات الاپے ان کی تان غالب پر ٹوٹی۔ غالب سے پہلے اس روایت کا خیر مقدم کرنے والوں میں علی الترتیب ابو طالب کلیم، طالب آملی، قدسی مشہدی، ظہوری ترشیزی اور بیدل وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ غالب کے بعد ہندوستان میں فارسی شاعری ایک عرصے کے لیے موقوف ہو گئی۔ تا آنکہ اقبال نے اسے دوبارہ زندہ کیا۔

اس دبستانِ فکر کے شعرا کا کلام پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعری ان کے نزدیک فلسفہ ہے۔ ان کے کلام میں نازک خیالی اور نکتہ آفرینی ہے۔ بات سے بات نکلنے کا انداز ہے۔ افسانہ از افسانہ می خیزد کا اسلوب ہے۔ بال کی کھال نکالنے کا ڈھب ہے فلسفیانہ افکار کی موشگافیاں ہیں۔ اسلوب بیان دقیق ہے۔ پیرایۂ اظہار مشکل ہے۔ تشبیہات نادر استعارات غریب، تلمیحات نامانوس اور ترکیبات پیچیدہ ہیں۔ اس دبستانِ فکر میں

کامیابی حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ اس لیے کہ اسلوب بیان میں بے جا تکلف اور تصنع کے باعث شعر میں شعریت پیدا نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دبستانِ فکر کے اکثر شعرا کا کلام ضلع جگت کا نمونہ بن کر رہ گیا ہے۔ اس میں لفظیات کی شعبدہ گری تو ہے لیکن تغزل یا شعریت کا جوہر مفقود ہے۔

اقبال کے سامنے فارسی شاعری کی مذکورہ تین روایتیں تھیں۔ انھوں نے ان روایتوں کی اندھا دھند تقلید نہیں کی بلکہ ان کی پیروی میں پھونک پھونک کر قدم اٹھایا ہے۔ اور جہاں تک ہو سکا حزم و احتیاط سے پہلو تہی نہیں کی۔ انھوں نے کسی مدرسۂ فکر کی تقلید کرتے وقت اس امر کا خاص خیال رکھا ہے کہ انفرادیت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ چنانچہ ان کے کلام میں جہاں شعری روایتوں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں وہاں ان کی شخصیت بھی جلوہ گر ہے۔ ایک بڑے شاعر کی پہچان یہی ہے کہ وہ شعر کی قدیم روایات کا احترام کرنے اور ان سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے کے باوجود اپنی شخصیت کو مجروح نہیں ہونے دیتا۔ اگر اس کی انفرادیت، اجتماعیت کے دبیز پردوں میں روپوش ہو جائے تو اس کی عظمت برقرار نہیں رہتی۔ وہ ایک عظیم شاعر بننے کی بجائے محض ایک نقال بن کر رہ جاتا ہے۔

اقبال نے کورانہ تقلید سے دامن بچا کر اپنے کلام کو عظمت بخشی ہے۔ انھوں نے مذکورۂ بالا دبستانوں کے صرف ان صحت مند عناصر کو اپنے کلام میں جذب کیا ہے جو ان کے موضوع اور اسلوب دونوں سے کامل مطابقت رکھتے ہیں۔ ایک شاعر کے لیے ایسے عناصر کا انتخاب بڑا دشوار مرحلہ ہوتا ہے۔ اقبال اس مرحلے سے نہایت کامیابی کے ساتھ گزرے ہیں۔ چنانچہ ان کے کلام میں اگر سبکِ خراسانی کی سادگی ہے تو اس میں پرکاری بھی ہے۔ سبکِ عراقی کی رنگینی ہے تو اس میں لطافت و حلاوت بھی ہے۔ سبکِ ہندی کی نازک خیالی اور نکتہ آفرینی ہے تو اس میں شعریت اور تغزل بھی ہے۔ غرض ان کے سارے کلام میں فنکارانہ عظمت ہے۔

سبکِ خراسانی کے شعرا، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، شعر میں جذبہ و احساس کی ترجمانی کرتے ہیں۔ انھیں فکر و خیال کی عکاسی کا شوق نہیں۔ لیکن اقبال نے محض جذبہ و

احساس کا اظہار نہیں کیا، فکر و خیال کو بھی شعر کے پیکر میں ڈھالا ہے۔ انھوں نے فلسفیانہ افکار اور حکیمانہ خیالات کو سبکِ خراسانی کے ہلکے پھلکے اور سیدھے سادے اسلوب میں نہایت چابکدستی کے ساتھ ادا کیا ہے، اور کسی بھی مقام پر یہ حقیقت فراموش نہیں کی کہ کوئی فکر یا خیال اس وقت تک شعر کہلانے کا مستحق نہیں جب تک جذبہ و احساس کے راستے سے سامنے نہ آئے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

حق اگر سوزی ندارد حکمت است　　شعر می گردد چوں سوز از دل گرفت

فکر و خیال میں جب تک خونِ جگر کی آمیزش نہیں ہوتی شعر نہیں بنتا۔ یہ بات صرف شاعری سے مخصوص نہیں، ہر فن لطیف کا مظاہرہ کرنے کے لیے فن کار کو خونِ جگر کی آمیزش کرنی پڑتی ہے کیونکہ "معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود"۔

سبکِ خراسانی کی آئینہ دار اقبال کی وہ غزلیں ہیں جو انھوں نے سعدی کے اسلوبِ بیان سے متاثر ہو کر کہی ہیں۔ ان غزلوں میں سعدی کی معاملہ بندی بڑی نکھری ہوئی صورت میں نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر صرف دو غزلوں کے مطلعے ملاحظہ ہوں:

بیا کہ ساقیٔ گل چہرہ دست بر چنگ است　　چمن زبادِ بہاراں جوابِ ارژنگ است

مرا ز دیدۂ بینا شکایتے دگر است　　کہ چوں بجلوہ در آئی حجابِ من نظر است

سعدی کے مطلعے علی الترتیب یہ ہیں:

دلی کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است　　ز عشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است

ہر کسی را نتواں گفت کہ صاحب نظر است　　عشق بازی دگر و نفس پرستی دگر است

ان غزلوں کے علاوہ اقبال کی وہ نظمیں بھی سبکِ خراسانی کے اسلوب میں رچی بسی ہیں جن کی بحریں مختصر ہیں۔ ان نظموں میں فکر و خیال، جذبہ و احساس کے راستے سے سامنے آئے ہیں۔ نظموں کے عنوانات یہ ہیں: حدی یا نغمۂ ساربانِ حجاز، شبنم، نوای وقت، سرود انجم، کرمکِ شب تاب۔ یہاں سب کی مثالیں تو پیش نہیں کی جا سکتیں، البتہ

دو ایک نظموں کے نمونے درج کیے جاتے ہیں۔ پہلے "کرمکِ شب تاب" کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

پروانۂ بی تاب کہ ہر سو تگ و پو کرد
بر شمع چناں سوخت کہ خود را ہمہ او کرد
ترکِ من و تو کرد
با اختر کی ماہ مبینی بکمینی ہو ہو
نزدیک تر آمد بتماشای زمینی
از چرخ برینی

ذیل کے اشعار "سرودِ انجم" کے ہیں:

ہستیٔ ما نظامِ ما — مستیٔ ما خرامِ ما
گردشِ بی مقامِ ما — زندگی دوامِ ما
دورِ فلک بکامِ ما
می نگریم و می رویم

آخر میں حدی یا نغمۂ ساربانِ حجاز کے دو بند ملاحظہ ہوں۔ اس نظم میں اونٹ ایسے بھدے جانور کی نہایت دلکش تصویر کھینچی گئی ہے۔ اسے آہوئے تاتار، حورِ بہشتی، لالۂ صحرا، شاہدِ رعنا، اور دخترِ صحرا جیسے خوبصورت القاب سے پکارا گیا ہے۔ پڑھنے والا اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ شاعر کسی چھیل چھبیلی، بانکی سجیلی اور الھڑ دوشیزہ کی تعریف کر رہا ہے:

دلکش و زیباستی
شاہدِ رعناستی
روکشِ حوراستی
غیرتِ لیلاستی
دخترِ صحراستی
تیز ترک گام زن۔ منزلِ ما دور نیست

لکۂ ابرِ رواں
کشتیٔ بی بادباں
مثلِ خضر راہ داں
بر تو سبک ہر گراں
لختِ دلِ سائیاں

تیز ترک گام زن منزلِ ما دور نیست

ان نظموں میں غضب کی روانی ہے۔ پڑھنے والا پھڑک اٹھتا ہے، اور سننے والا سر دھننے لگتا ہے۔ اسے یوں محسوس ہوتا ہے گویا موسیقی کا بحرِ ذخّار ٹھاٹیں مار رہا ہے۔ خود اقبال بھی ان نظموں کے وجد آفریں ترنم اور کیف زا نغمے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے چنانچہ فرماتے ہیں :

نغمۂ من دل کشای   زیر و بمش جانفزای
قافلہ ہا را درای   فتنہ ربا فتنہ زای

یہ مثالیں، جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، صرف تین نظموں سے پیش کی گئی ہیں۔ مذکورۂ بالا عنوانات کی تمام نظمیں اسی انداز میں لکھی گئی ہیں۔ نظموں کا لب و لہجہ زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ہم سبکِ خراسانی کی آئینہ دار ہیں۔ ہم پر سبکِ عراقی یا سبکِ ہندی کے اثرات مرتسم نہیں ہوئے ہیں۔

سبکِ عراقی کا ترجمان اقبال کے کلام کا وہ حصّہ ہے جس میں رومی اور حافظ کے اندازِ فکر اور اسلوبِ بیان کے اثرات اقبال کے کلام پر مترتب ہوئے۔ اس کا اعتراف اقبال نے جا بجا کیا ہے۔ مثلاً فرماتے ہیں :

بیا کہ من زخُمِ پیرِ رُوم آوردم   مئی سخن کہ جوان تر ز بادۂ عنبی است

مطرب غزلی بیتی از مرشدِ روم آور   تا غوطہ زند جانم در آتشِ تبریزی

رومی کے افکار و اسالیب کے اثرات تعجب خیز نہیں کیونکہ اقبال خود ان اثرات کے

معترف ہیں۔ وہ رومی کو اپنا پیر و مرشد تسلیم کر چکے ہیں۔ البتہ حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ کلام اقبال پر حافظ کے کلام کا بڑا گہرا اثر ہے۔ اگرچہ حافظ اور اقبال کے درمیان ذہنی فاصلہ ہے لیکن یہ فاصلہ صرف نظریات و خیالات کا ہے، اسالیب بیان کا نہیں۔ اقبال کو حافظ کے نظریات سے بیر ہے۔ ان کے خیال میں حافظ کا کلام ایک ایسا طلسم ہے جس میں پھنس کر انسان حرکت و عمل سے محروم ہو جاتا ہے۔ اقبال حرکت و عمل کو زندگی اور سکوت و جمود کو موت تصور کرتے ہیں۔ گویا ان کے نظریے کے مطابق حافظ زندگی کی بجائے موت کی دعوت دیتا ہے۔ اسی نظریاتی اختلاف کے باعث انھوں نے "اسرارِ خودی" میں کچھ ایسے اشعار لکھ دیے تھے جن میں حافظ کی مذمت تھی۔ لیکن جب حافظ پرستوں نے ان پر لے دے کی تو انھوں نے یہ اشعار حذف کر دیے۔ وہ اشعار یہ ہیں:

ہوشیار از حافظِ صہبا گسار　　جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار
نیست غیر از بادہ در بازارِ او　　از دو جام آشفتہ شد دستارِ او

بگزر از جامش کہ در مینای خویش　　چوں مریدانِ حسن دارد حشیش

نظریاتی اعتبار سے اقبال کو حافظ سے خواہ کتنا اختلاف ہو، ادبی لحاظ سے وہ حافظ کی قدر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حافظ کے اسالیب بیان سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ یہاں حافظ اور اقبال کے کلام سے ساری مثالیں تو درج نہیں کی جا سکتیں البتہ چند غزلوں کے مطلعے ملاحظہ ہوں:

بشاخِ زندگی مانمی ز تشنہ لبی است　　تلاشِ چشمۂ حیواں دلیلِ کم طلبی است

سرخوش از بادۂ تو خم شکنی نیست کہ نیست
مستِ لعلینِ تو شیریں سخنی نیست کہ نیست

اگرچہ زیب سرش افسر و کلاہی نیست　　گدای کوی تو کمتر ز پادشاہی نیست

جہانِ عشق نہ میری نہ سروری داند ہمیں بس است کہ آئین چاکری داند

حافظ کے مطلع بالترتیب یہ ہیں:

اگرچہ عرضِ ہنر پیشِ یار بی ادبی است زباں خموش ولیکن دہاں پُر از عربی است

روشن از پرتو رویت نظری نیست کہ نیست منتِ خاک درت بر بصری نیست کہ نیست

جز آستانِ توام در جہاں پناہی نیست سرمرا بجز ایں در حوالہ گاہی نیست

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند

ان غزلوں کے تقابلی مطالعہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اقبال، حافظ کے کلام سے کتنے متاثر ہیں؟ فرق صرف افکار و خیالات کا ہے ورنہ اسلوبِ بیان کو مدنظر رکھیں تو یہ فیصلہ کرنا دشوار ہوگا کہ کونسی غزل کس کی ملکیت ہے؟ اقبال کے ہاں وہی ردیف، وہی قافیہ، وہی وزن، وہی بحر، غرض وہی زمین ہے جو حافظ کے ہاں ہے۔ گویا پیمانہ ایک ہے، شراب مختلف ہے یا یوں سمجھ لیجیے کہ راستہ ایک ہے، منزل جدا ہے۔

سبک ہندی میں اقبال نے اکبری عہد کے شعرا عرفی، نظیری، اور فیضی سے بہت استفادہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ جن شعرا سے وہ متاثر ہوئے ان میں ظہوری، بیدل اور غالب کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اقبال نے ان شعرا کے اثرات بلا واسطہ اور بالواسطہ دونوں طریقوں سے قبول کیے ہیں۔ بلاواسطہ تو اس طرح کہ خود ان شعرا کے کلام کا مطالعہ کیا اور ان کے افکار و خیالات اور اسالیبِ بیان وغیرہ سے متاثر ہوئے۔ لیکن اثر قبول کرتے وقت انھوں نے اس امر کا خاص خیال رکھا کہ ان کے اندازِ فکر اور اسلوبِ بیان سے تصادم نہ ہو بالواسطہ اس طرح کہ انھوں نے غالب کو پاک و ہند کے تمام شعرا کا نمایندہ سمجھا اور اس کے کلام سے جی بھر کر استفادہ کیا۔ اس لحاظ سے غالب کو اقبال کا پیشرو کہا جا سکتا ہے۔ اقبال کے کلام میں غالب کے کلام کی طرح، نظیری کی معاملہ بندی ہے۔ عرفی اور فیضی کا جوشِ بیان

ہے۔ بیدل کی حقائق پرستی اور علامتیت ہے۔ ظہوری کی تجمل پسندی ہے۔ اقبال اور غالب کی شخصیتوں میں بھی ایک گونہ مماثلت پائی جاتی ہے۔ انھیں غالب کا تند و تیز لب و لہجہ، جارحانہ نقطۂ نظر، غم میں نشاط کا پیوند، پُرخروش اور بارعب آواز، اور حقائق سے دلچسپی بہت پسند ہے۔

مذکورہ شعرا کے اندازِ نظر اور اسلوب بیان کے اثرات کلام اقبال میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ یہ اثرات کہیں تو کسی شعر کی تضمین بن کر نمودار ہوتے ہیں، کہیں کسی شخصیت پر نظم کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں، اور کہیں محض اشعار کے لب و لہجہ اور کلام کے مزاج سے ہویدا ہوتے ہیں۔ یہاں پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ محض کسی شعر کی تضمین کر دینے یا کسی شاعر پر نظم لکھ دینے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی کہ قرار واقعی اقبال کو اس شاعر کی تعریف مقصود ہے۔ کیونکہ اس قسم کی تعریف رسمی یا شاعرانہ طور پر بھی کی جا سکتی ہے۔ اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ اقبال جس کی تعریف کرتے ہیں، نہ دل سے کرتے ہیں۔ نہیں تو نہیں کرتے۔ جھوٹی تعریف یا رسمی اور شاعرانہ توصیف ان کی فطرت میں داخل نہیں۔

آخر میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اقبال فارسی میں ایک خاص اسلوب فکر اور ایک خاص طرزِ بیان کے مالک ہیں۔ فارسی ادب میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے جدید تصورات کو فارسی شاعری کے پرانے مگر مقبول عام سانچوں میں ڈھال کر ایک عظیم الشان ادبی روایت قائم کی۔ اس روایت کو اگر "اقبالیت" سے تعبیر کیا جائے تو زیادہ مناسب ہے

اقبال نے اگرچہ جدید ایرانی شاعروں کی طرح ہیئت اور صنفِ سخن کے نئے تجربات نہیں کیے مثلاً 'سرود' یا 'تصنیف' وغیرہ نہیں لکھی، لیکن انھوں نے پرانے پختہ تصورِ شعر میں ردوبدل ضرور کیا ہے۔ ان کے کلام میں جملہ اصنافِ شاعری موجود ہیں۔ مثلاً غزل، نظم، قطعہ، رباعی، مثنوی، ترکیب بند، ترجیع بند، مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مسمط، مستزاد، وغیرہ۔ ان نظمیہ ڈھانچوں اور شعری سانچوں میں انھوں نے قابل قبول تبدیلیاں کی ہیں۔ مثلاً غزل میں تخلص کا لانا اور پھر مقطع میں لانا پہلے ضروری خیال کیا جاتا تھا مگر اقبال نے اسے غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ پہلے قطعہ میں صرف غیر عاشقانہ اور غزل میں محض عاشقانہ یا عارفانہ مضامین باندھے جاتے تھے لیکن اقبال نے اس رسم کو فضول جان کر

ترک کر دیا۔ انھوں نے غزل، نظم، اور قطعہ کی حدود ایک دوسرے سے قریب تر کر کے تخصیص مضامین کی قید ہٹا دی۔ ترکیب بند اور ترجیع بند میں انھوں نے نئی نئی صورتیں پیدا کیں۔ مسمط کے نئے ایرانی سانچے اپنا لیے۔ مثلث، مخمس، مسدس اور مستزاد کو جوش انگیز مضامین کے لیے استعمال کیا۔ مثنویوں میں رومی، سنائی اور محمود شبستری کے انداز میں تسلسل پیدا کیا۔ بعض بعض مقامات پر رومی اور نظامی کی طرح حکایتیں اور تمثیلیں بھی پیش کیں۔ علاوہ ازیں بعض مثنویوں مثلاً جاوید نامہ اور مسافر میں میر تقی میر، میر اثر، اور میر حسن کی اردو مثنویوں کی طرح مسلسل مضمون میں غزلیات کے خوبصورت پیوند لگائے۔ یہی حال ان کی رباعیات کا ہے۔ انھوں نے رباعی اور مربع کے امتیاز کا خاتمہ کر دیا، اور رباعی کے مخصوص اوزان کی پرواہ نہ کی۔ مختصر یہ کہ اقبال کے کلام میں ہر جگہ ایک نیا پن ہے، ایک تازگی ہے، ایک جدت ہے، اور یہی درحقیقت ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔

اسلام اور چند معاشی مسائل

سید یعقوب شاہ

اس کتاب کے مصنف مالیات کے بھی ماہر ہیں اور دینی علوم سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ اپنی اس تصنیف میں انھوں نے ربوٰ، زکوٰۃ اور بیمہ جیسے زندہ اور اہم معاشی مسائل پر اظہار خیال کیا ہے اور کتاب و سنت، تاریخ، عمرانیات اور اقتصادیات کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد اپنے نتائج فکر شستہ اور سلیس انداز میں قلم بند کیے ہیں۔

قیمت عام ایڈیشن ۵ روپے　　عمدہ ایڈیشن ۶٫۵۰ روپے

ملنے کا پتہ

سیکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ، لاہور